

جاری تھی۔ میں حیران بھی ہوا کہ کپاس تو تھوڑی ہی تھی۔ دھنے جانے کے ساتھ روئی کا کتنا ابزار لگ گیا ہے۔ اصل میں ابھی تک وہی عمل چل رہا تھا کہ میری اپنی یادوں میں دنیا جہاں کی یادیں آلمی تھیں۔ اس وقت تو خیر میں نہ حال تھا۔ اتنی سکتی نہیں تھی کہ پرانی یادوں کو اپنی یادوں میں رلنے ملنے سے روک سکوں۔ اب اتنا بے سکت تونہیں تھا۔ حالت کافی بہتر تھی۔ کہاں رقیق چیزوں پر گزارہ تھا۔ کہاں اب شور بے کے ساتھ چھکا کھارا تھا۔

”صاب“ آپ نے بہت کم کھایا، ”نعت خاں“ میری خواراگ سے مطمئن نظر میں آتا تھا۔

”نعت خاں“ اور کتنا کھاؤں اتنا تو کھالیا۔ کئی دن کے بعد آج سیر ہو کر کھایا ہے۔“

”اصل میں جی، آپ کی بھوک کم ہو گئی ہے۔ خواراک پوری کھائیں گے۔ پھر جان آئے گی۔“

”اچھا پانی پلاو۔“

نعت خاں نے جلدی سے پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے پانی پیا اور فوراً ہی بیٹھے سے لیٹ گیا۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی تو کھانا کھایا تھا۔ فوراً ہی آنکھیں مند نے لگیں۔ خیال تھا کہ نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤں گا۔ مگر اندر کی دھنک دھنک نے سونے نہیں دیا۔ روئی کا ابزار لگتا چلا جا رہا تھا۔ مگر ہاں میں کیا کہہ رہا تھا کہ اس وقت تو اتنی تقاضت تھی کہ دنیا جہاں کی یادوں با توں کو اپنی یادوں میں رلتے ملتے دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اتنا بے دم نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ عمل جاری تھا۔ شاید اب مجھے اس کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ کہاں کہاں کی واردات، کہاں کی بات۔

”میرے لال، کتنی دفعہ سنو گے وہ کہانی۔“

”پھوپھی اماں ایک دفعہ اور۔“

”اچھا تو سنو۔ ایک تھی میتا۔ اس کا پڑوی تھا ایک کوا۔ میتا تو گھر والی تھی۔ یہ بخت مار گھرا تھا۔ میتا روز شام پڑے اپنے گھونسلے میں گھس جاتی اور رات آرام سے گزارتی۔ کوئی بیمارہ تھا کہا بارا آتا اور میتا کے گھونسلے کے برابر والی ٹھنپ پیٹھے کے اوپر گھنٹے لگتا۔ ایک دن میتا نے طعنہ دیا کہ اے بھیا کوئے، تم کب تک بے گھر بے در رہو گے۔ کوئے کو میتا کی بات کھا گئی۔ سوچا کہ مجھے بھی گھر بنانا چاہئے۔ اور ایسا گھر ہو کہ میتا بھی اسے دیکھ کے عش عش کرے تو بھیا اس کوئے نے ایک بننے کی دکان میں کوئل لگایا۔ بار بار اندر جاتا اور نمک کی ایک ڈلی چوچی میں دبا کے لے آتا۔ اس طرح اس نے بہت سانک جمع کر لیا۔ اس نمک سے اس نے اپنا گھر بنایا۔“

”پھوپھی اماں نمک کا گھر۔“ من کتنا حیران ہو رہا تھا۔

”ہاں پیٹا نمک کا گھر۔ گرمی کی دوپھروں میں ایسا چکنے تھا جیسے نمک کا نہ ہو، شیشے کا گھر ہو۔ مگر اس کے بعد آگئی برسات اور لگ گیا جھمکا۔ اے لووہ مکان تو یہندہ میں محل گھلا کے ختم ہو گیا۔ مینا نے طعنہ دیا کہ اے بھیاتم نے گھر بنایا بھی تو نمک کا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ موسم سدا ایک سانہ نہیں رہتا۔ گرمی کے بعد برسات تو آئی ہی تھی۔ نمک ہی تو تھا، محل گیا۔ مینا کی بات کوے کوتیر بن کے گئی۔ اس نے سوچا کہ اب کے ایسے سامان سے گھر بناؤں جس پر برسات اثر نہ کرے۔ بس یہی سوچ کے اس نے بہت سارا موم جمع کیا اور گھر بنانا شروع کر دیا۔ اس کا موم محل برسات میں محل کے ایسا لگے تھا جیسے سنگ مرمر کا بنا ہوا ہو۔ برسات کے بعد جاڑے آئے کوئے نے پورا موسم آرام سے گزارا۔ مگر بھی اس کے بعد آگئی گرمی۔ اے بھیادھوپ جو چکنی تو سارا موم پھحل گیا۔ کوئے کا گھر پھر ڈھنے گیا بلکہ بہہ گیا۔ کوہ بہت اداس ہوا۔ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا کہ مجھ کوئے کی قسم میں گھرنہیں۔ اور پھر پہلے کی طرح ٹھنی پر بسیرا کرنے لگا۔“

میرا دھیان پھرنا گیشری رانی کی طرف چلا گیا۔ صح رولی تھی۔ پچھلا جنم یاد آنا تو ایک مصیبت ہے۔ حافظہ اپنے محمد و دادرمے میں گردش کرتا رہے بس اسی میں عافیت ہے۔ حافظہ کی بھی اپنی ایک لکشم ریکھا ہوتی ہے۔ اس ریکھا سے قدم نکالا اور مصیبت میں چپنے۔ آگے تو جنگل ہی جنگل ہے۔ ایسا جنگل جس کا کوئی اور چھوڑنہیں ہے اور پھر را کش۔ تو گیشری رانی صح رولی بلکہ اسے تو زیادہ نی رو نا پڑ گیا۔ اس کارن کہ راجہ کو بھی اپنا پچھلا جنم یاد آ گیا۔ بلکہ راجہ کو تو اس سے بھی پچھلا جنم یاد آ گیا۔ مصیبت در مصیبت۔ ایک جنم خوار ہونے کے لئے کیا کم ہوتا ہے۔ پھر دوسرا جنم کیوں۔ اور خالی دوسرا نہیں جنموں کا تو کوئی انت ہی نہیں۔ جنم جنم کی خواری۔ نا گیشری رانی سمجھ رہی تھی کہ جب وہ اور راجہ نہ ہنسنے تھے اور مانسر و درجیل کے کنارے رہتے تھے۔ تب بہت سکھی تھے۔ مگر وہ کہ کتنے دن کا تھا۔ پھر آندھی چل پڑی۔ اس آندھی میں وہ پھر ایک دوسرے سے پچھڑ گئے۔ نا گیشری رانی کو یہ بات ذرا بعد میں یاد آئی۔ وہ پھر دکھی ہو گئی۔ میمون کو دیکھو۔ اسے یہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ پچھوچھی اماں نے یہ کہانی کب سنائی تھی۔ جب اسے یاد آیا تو بالکل گم ہو گئی۔ پھر اسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ آندھی میں پچھڑ کر پھرمل گئے تھے۔ کب ملے تھے؟ نہیں ملے تھے۔

”ملے تھے۔“ میں نے اصرار کیا اور کہانی کے بعد کے حصے کی کئی ایک تفصیلات اسے یاد دلائیں۔ مشکل سے اسے یاد آئیں۔ ”اچھا تو پھرمل گئے ہوں گے۔“ ایسے کہا جیسے اسے ان کے ملنے کا اعتبار نہ آیا ہو۔ اور پھر ایسی چپ ہوئی کہ دیر نک بولی ہی نہیں اور سخت اداس۔

”بیچاری ہنسنی کی پتائے تمہیں اداس کر دیا۔“ میں نے اسے چھیڑا کہ شاید اسی طرح کچھ بولے۔

”خیروہ تو کہانی ہے۔“ آخروہ بولی ”اصل میں مجھے اماں یاد آگئیں۔“

اب میں اداس ہو گیا۔ پھوپھی اماں مجھے وہاں رہتے ہوئے دیے تو مستقل یاد آتی رہی تھیں۔ لیکن اس وقت میمون نے ان کا ذکر اس طرح کیا کہ میں افسر دہ ہو گیا۔ ان کے نہ ہونے کا اس وقت کچھ زیادہ ہی شدت سے احساس ہوا۔ یہ بڑی بھاگی کے درمیان میں کوڈ پڑنے سے پہلے کی بات ہے بلکہ اس کے بعد تو اور شدت سے یہ احساس ہوا پھوپھی اماں ہوتیں تو پھر یہ صورت تھوڑا ابھی پیدا ہوتی۔ وہ ہوتیں تو میمون بھلا مجھ سے اس کھڑکی انداز میں بات کرتی۔ خیر یہ بات تو درمیان میں یونہی آگئی۔ ذکر تو یہ تھا کہ پھوپھی اماں نے مجھے کہانیاں کہنی سنائی تھیں اور ہنس ہنسنی کی توجہ کی تھی کہانیاں انہیں یاد تھیں۔ ہنس ہنسنی کاملاً اور پچھڑنا، پھر ملنا پھر پچھڑ جانا، جیسے جگہ وصال کی ازلی ابدی داستان اصل میں ہنس ہنسنی کی کہانی ہے اور یہ کوئی اقلیم سے اڑ کر آتے تھے۔ اڑتے اڑتے کبھی کسی جھیل پر اتر پڑے کبھی کسی محل کی دیوار پر آن اترے اس رنگ سے ک محل میں بیٹھی شہزادی انہیں دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی ہے۔ کبھی تال ٹلیوں سے بے پرواہ بستیوں اور بتوں سے بے تعلق، محلوں و محلوں سے بے نیاز آسان کی بلندیوں میں یوں اڑتے نظر آتے جیسے کسی پاک صاف جھیل میں تیر رہے ہیں اور آن کی آن میں اوچھل ہو گئے اور ہمیشہ بعد میں یہی پڑھلاتا کہ یہ تو کسی دور دیس کے راج رانی ہیں یا راجملار راجملاری کہ اس جنم میں آ کر ہنس ہنسنی بن گئے ہیں اور یہ کہاب ہنس ہنسنی ہیں اگلے جنم انہیں پھر راج رانی بن جاتا ہے۔ اس وقت مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ ہنس ہنسنی کی یہ ساری کہانیاں کیوں میرے حافظہ میں امنڈ رہی ہیں۔ کیوں میں کوشش کر رہا ہوں کہ میمون کو بھی یہ کہانیاں یاد آ جائیں اور کیوں وہ ہر کہانی کے حوالے سے ہنس ہنسنی کے ملنے پچھڑنے کے تذکرے پر چپ اور اداس ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ بھی کسی پچھلے جنم میں..... مگر یہ احساس تو مجھے ستارہ تھا کہ جیسے میرا کوئی پچھلا جنم تھا اور میں خیر بہر حال جبھی تو وہ سادھو مجھے رہ کر یاد آ رہا تھا جو کہتا تھا کہ مجھے اپنا پچھلا جنم یاد ہے۔ کتنی بار خیال آیا کہ اسے ڈھونڈنا چاہئے کہاں ہے وہ جیتا یا مر گیا۔ کب مر؟ پچھلے جنم کا حال سنانے کے بعد؟..... اچھے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ دوار کا میں ان دنوں ہیں برستا تھا۔ مگر نگر اور بستیوں کا سدا ایک طور نہیں رہتا۔ پنچھیں کب ہیں برستے برستے قیامت ٹوٹ پڑے۔ ”زیندر“ میں نے جب ساگر کی اور دیکھا تو کیا دیکھا کہ ساگر میں سانپ ہی سانپ جیسے ساگرنہ ہو سانپ ساگر ہو۔ میں ترنٹ ہی وہاں سے پلانا آگے چلا تو کیا دیکھا کہ ایک برش تلے بلدیو جی بیراں مارے، آنکھیں موندے بیٹھے ہیں۔ پر منہ ان کا بھٹ کے سامان کھلا ہوا اور ہے متر میں نے دیکھا کہ بلدیو جی جو سور ماوس بلوانوں کے پیچ سامنہ سامان تھے گھٹ گھٹا کے تلک سے رہ گئے تھے۔ زری بڈیاں کہ مٹھی میں آ جاویں۔ ان بڈیوں کے پیچ منہ جیسے بانی اور بانی کے بھیترے سے نکلتا سانپ کہ جو گیوں کے انگ پر ملے بھیوت کے سماں سفید۔ متر میں بھوچک رہ

گیا۔"

نزیندر گنیش کا منہ تک رہا تھا۔ پھر بولا" ہے گنیش پھر تو یہ نگ نکت میں ہے۔ کوئی گیانی ہی یہ بتائے گا کہ یہ کیا لیلا ہے۔ میں تو جانوں کہ ہم گور و شہجومہاراج کے پاس چلیں اور ان سے پوچھیں۔

دونوں ترنات ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بھاگے دوڑے وال پہنچے۔ گورو کے چون چھوئے "ڈنڈوت کیا" اور ہاتھ باندھ کے چپ بیٹھ گئے۔ گور و مہاراج نے کتنی دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ بڑی ہوئی سفید پلکوں کے پیچے سے اسے انہیں دیکھا اور آنے کا کارن پوچھا۔
"ہے گور و مہاراج میں نے اسی انہوںی دیکھی ہے کہ بتاتے ہوئے جی کا نیتا ہے۔"

"میرے شش، تو نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہے گور و نند دیکھنے پر بھی اتنا کچھ دیکھ لیا۔ بلد یو جی کے منہ کو بانی بنتے دیکھا بانی بے سانپ نکلتے دیکھا۔"

گور و مہاراج نے آنکھیں موند لیں۔ پھر آنکھیں کھولیں۔ بزرگ بڑائے اوم تت ست۔ اوم تت ست۔ "پھر گھور کر نزیندر کو دیکھا ہے متحرا نگری کے باہی تو یاں یہ کیا کر رہا ہے۔ جاتا کیوں نہیں۔"

"گور و مہاراج یہ گھر مجھے جانے نہیں دیتا۔

"کیا کہت ہے۔"

"میں روز بھور بھیئے اپنی گھری بغل میں داب نکلتا ہوں۔ پر جب نگر سے پاؤں باہر نکالنے لگتا ہوں تو سامنے کھڑے چیلپیں کی پھنگنگ سے ایک شیل کٹھنہ پھڑ پھڑا کے اڑتا ہے اور میرارتہ کاٹ جاتا ہے۔ میں وہیں سے لوٹ آتا ہوں۔"

گور و مہاراج چپ رہے۔ پھر بولے۔ "ہے مور کھ،" متحرا کی اجزی گھری میں دکھ تھوڑے تھے کہ تو یاں یہ کشت کچھنے آگیا۔ جا اپنے نرک میں جا کے اپنے دکھ بھوگ۔ ہمیں اپنے نرک میں اپنے کشت کچھنے دے۔

"اور مہاراج وہ شیل کٹھنے۔"

"نیل کٹھنے۔ وہ اب کہاں ہے۔ سانپ نے سب پنچھیوں کو نگل لیا۔"

"اور گور و مہاراج ہم..... ہو سانپ تو..... گنیش بولتے بولتے کاٹ اٹھا اور چپ ہو گیا۔

گور و مہاراج نے جواب میں آنکھیں موند لیں اور بزرگ بڑائے لگے "و م ت ست۔ اوم ت ست۔ اوم ت ست۔" "ڑر ڑر ڑر ڑر ڈیلی فون کی گھنٹی" ہیلو۔ اچھار فیض صاحب جی..... مجھ بھائی۔ انہیں تو پہلے آپ ہی کی طرف جانا تھا۔ یہی کہہ کر لکھے تھے کہ پہلے

رفیق صاحب کی طرف جاؤں گا۔ انہیں ساتھ لے کر غازی صاحب کے جلسہ میں جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں وہ ادھر آئے تو تھے۔ مگر میرے دماغ میں کیا بھوڑا لکھتا تھا کہ غازی صاحب کا وعظ سننے جاتا۔ اتنا فال تو وقت تو مجوہ بھائی ہی کی پاس ہے۔ اصل میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ابھی گھر پہنچے ہیں یا نہیں۔ نہیں پہنچے ہیں تو میں لکھتا ہوں اور جا کر دیکھتا ہوں جلا آج کل کے جلسوں میں شرفاء کا کیا کام۔ پتہ نہیں وہاں کیا ہوا ہے۔“

رفیق صاحب کا گھبرا یا ہوا الجب چھٹلی کھارہ تھا کہ جلسہ میں کوئی گزبر ہوئی ہے۔ ”کیوں وہاں کوئی گزبر ہوئی ہے۔“

”ہمارے علاقہ میں جلسہ ہوا اور گزبر نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ ہوا ہی ہو گا۔ جا کر دیکھتا ہوں۔“

”رفیق صاحب۔“ میں اب فکر مند ہو چلا تھا۔ آپ نے تو فکر میں ڈال دیا۔

”نہیں یا رزیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔ یہاں یہی ہوتا رہتا ہے۔ گزبر تھوڑی ہوتی ہے۔ یہاں ہماری کلی کے لوگ اپنی طرف سے اس میں کلی پہنندے نے ٹانگ دیتے ہیں۔“

”مگر تشویش کی بات تو ہے۔“

”وہ تو ہر صورت میں ہے۔ بہر حال آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپس آ کر فوراً آپ کو فون کروں گا۔“

”بلکہ میں یہ کروں گا کہ مجوہ بھائی کو وہاں سے لے کر سیدھا ادھر ہی آ جاؤں گا۔“

”جلدی آئیے۔“

”جلدی ہی آؤں گا۔“

فون بند ہو گیا۔ رسیور رکھ کر میں نے نظر انھائی تو دیکھا کہ نعمت خان کھڑا ہے۔ چہرے پر ہوانیاں اڑ رہی ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ اس شخص کو کیا ہوا۔

پوچھنے لگا۔ ”کیا کہتے ہیں رفیق صاحب جی۔“

” بتا رہے تھے کہ غازی صاحب کے جلسہ میں کچھ گزبر ہوئی ہے۔“ ”جواد صاب جی! وہاں پہ تو بم پہنٹا ہے۔ بہت جانیں گئیں۔ اللہ رحم کرے۔“

میرے قدموں تھے سے زمین سرک گئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ رفیق صاحب اتنے گھبرائے ہوئے کیوں تھے۔

”تم نے کس سے سنا۔ لوگ افواہیں بھی تو اڑاتے ہیں۔“

”نہیں جی۔ یہ افواہ نہیں ہے۔ سوسائٹی میں تو تمہلکہ پڑا ہوا ہے۔“

”اچھا۔“ بس اس سے آگے میں پکھنہ کہہ سکا۔ اندر سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”بھلا جو صاب جی وال پر کیوں گئے تھے۔“

”ہونے والی بات کا پہلے سے کسی کو پتہ تو نہیں ہوتا۔“

”اللہ حرم کر دے اور جو صاب جی خیریت سے گھر آ جائیں۔“

”فکر نہ کرو اللہ حرم ہی کرے گا۔ رفیق صاحب انہیں لینے گئے ہیں۔ انہیں لے کر ادھر ہی آ جیں گے۔“

”اچھا کس وقت تک آ جائیں گے۔“

”بس جلدی ہی آ جیں گے۔“

نعمت خان تھوڑی دیر پر یشان کھڑا رہا جیسے اب اس کی سمجھنہ آ رہا ہو کہ آگے کیا بات کرے اور کیا پوچھے۔ پھر خاموشی سے وہاں سے سرک گیا۔ ادھر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ جو میں اپنے خیالوں میں غرق لیٹا تھا وہ ساری کیفیت ہی اب زائل ہو چکی تھی۔ دماغ جو ذرا سے اشارے پے بہت اور کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ اس وقت اپنی ساری چوکڑی بھول گیا تھا، بس جیسے سن ہو گیا ہو۔ کتنی دیر تک میں بت بنا بیٹھا رہا۔ چونکا اس وقت جب نعمت خان نے آہستگی سے کھانا سامنے لا کر رکھ دیا۔ وہی اپنا پرہیزی کھانا۔ اس نے کہا میں نے کھانا شروع کر دیا۔ کیا کھایا کیا نہیں کھایا، پتہ ہی نہیں چلا۔ پھر اسی طرح گم صم۔“

دیر بعد پھر نعمت خان نے کمرے میں جھانکا۔ اب تو بہت دیر ہو گئی۔ آئے نہیں۔ ہاں اب تک تو آ جانا چاہئے تھا میں نے کوشش کی کہیرے لہجے سے کسی قسم کی تشویش ظاہر نہ ہو۔

”اللہ خیر کرے۔ نعمت خان نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گیا مگر زیادہ وقت نہیں گز را تھا کہ نعمت خان پھر آہستہ سے کمرے میں داخل ہوا۔ قریب آ کر پوچھا ”کوئی فون بھی نہیں آیا۔“

”نہیں۔“ میں نے خیک لہجے میں کہا۔

”جانے کیا بات ہے کہ اتنی دیر لگادی۔“

میں کتنی دیر سے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ مگر نعمت خان بار بار کمرے میں آتا

بس کوئی ایک فقرہ کہتا گرایا۔ اس کے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی میری ساری کوشش پر پانی پھر جاتا۔ اب وہ میرے پلنگ کے قریب ہی آ کر فرش پر اس طرح پرسہ گیا تھا کہ اس کا سر میری پٹی سے لگ رہا تھا۔ ٹھیک کہ ایسے وقت میں ایک سے دو بھتے ہوتے ہیں مگر اسی صورت میں کہ بات کریں کہ جس سے جی بھلے، جہاں دھیان ہے وہاں سے دھیان بھے۔ مگر میری خاموشی کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے بھی جیسے منہ سی لیا ہو۔ تو وہ بھی چپ میں بھی چپ۔

”صاب جی،“ آخر اس نے زبان کھولی۔ ”آپ سو جائیں آپ کو تو دیے بھی ڈاکٹر نے آرام کرنے کے لئے کہا ہے تو آپ سو جائیں میں جاگ رہا ہوں۔ ٹیلی فون آیا تو بھی سن لوں گا۔“
”ٹھیک ہے۔ سو جاؤں گا۔ نیند آئے تو کسی۔“

”طبعیت پر بیثان ہو تو نیند مشکل ہی سے آتی ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گیا۔

”آپ جی رفیق صاحب جی کے گھر ٹیلی فون کر کے تو ذرا پوچھیں پڑھ تو چلے کہ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

اس تجویز نے واقعی سوچنے پر مجبور کیا۔ کچھ دیر مذبذب میں رہا مگر پھر جلدی ہی میں نے فیصلہ کر لیا۔ سوچا کہ رفیق صاحب کی تیگم خواہ مخواہ پر بیثان ہو جائیں گی۔ میں نے نعمت خان کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اتنی رات گئے گھر پر فون کرنا اور گھروالوں کو بے آرام کرنا کچھ مناسب بات نہیں ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ وہ بڑا بڑا اور چپ ہو گیا۔

”صاب جی۔“ کتنی دیر بعد اس نے زبان کھولی ویسے تو میں جاگ رہا ہوں مگر نیند کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ یہ سمجھت تو سویں پہ بھی آ جاتی ہے۔ تو اگر میری آنکھ لگ جائے اور دروازے کی گھنٹی بجے تو جی آپ دروازہ کھولیں نہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں اصل میں اس کی بات پر کچھ چکدا سا گیا تھا۔

”صاب جی آج کل کسی کا کوئی اعتبار نہیں لوگ تو دن کے وقت بھی کندھی لگا کے بیٹھتے ہیں یہ تو رات کا شیم ہے۔ میں تو جی بھگت چکا ہوں۔“

”بھگت چکے ہو؟ کیا بھگت چکے ہو؟“ مجھے کسی قدر تجسس ہوا وہ جی میں مجھے صاب جی کو جو بتا رہا تھا۔ پر پوری بات کہاں بتائی تھی۔ آپ تو دونوں ہسپتال میں تھے۔ میں گھر میں اکیلا۔ رات کا شیم رات کا منجھلا پھر ہو گا۔ دروازے کی گھنٹی بجی میں نے دل میں کہا کہ نعمت خان یہ تو گزر بڑی کی بات ہے۔ اس شیم بھلا آدمی آئے گا۔ تو میں چپ رہا پھر گھنٹی بجی پھر میں چپ تیسری دفعہ پھر گھنٹی بجی میں تو جی

ایے ہو گیا جیسے گھر میں ہوں ہی نہیں۔ اور کاسانس اوپر نیچے کا نیچے۔ پھر گھنٹی نہیں بجی جیسے کوئی سیر ہیاں اتر رہا ہو۔ میں نے کہنا نعت خان تم نیچے گئے۔ جو اوصاحب جی وقت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ اور یہ وقت تو ویسے ہی بہت خراب ہے۔

میں خاموشی سے ستارہا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔ شاید اس بیان سے میں نے کوئی ایسا اثر بھی قبول نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اب میرے کان دروازے کی طرف تھے۔ جیسے اب گھنٹی بجی۔ دروازے بے شک نہ کھولوں مگر پوچھوں گا تو سہی کہ کون ہے۔ یا یہ بھی نہیں پوچھنا چاہئے۔ یا ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ گھنٹی نہ بجائے بہت کان لگائے کہ قدموں کی آہٹ سنائی دے۔ کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔

”اصل میں جی مجھے اپنے باپ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔“ میری خاموشی سے فائدہ اٹھا کر وہ پھر جاری ہو گیا۔ ”ہماری جی بہت چھوٹی سی بستی تھی۔ چاروں طرف جنگل ہی جنگل مجھے کام کے لئے شہر جانا پڑے۔ لوٹنے ہوئے شام پڑ جاتی تھی کبھی کبھی بالکل ہی رات ہو جائے تھی۔ ویسے تو جی میرے پاس لامبی ہووے تھی پر پھر بھی دل دھکڑ پکڑ کر تارہوے تھا۔ ایک بات میرے باپ نے مجھ سے کہہ کر تھی کہ للا رات کو یا سناہنی دو پہر میں اگر کوئی تھجے پکارے اور دکھائی نہ پڑے تو پٹ کے جواب مت دیجیو۔ ایک بیری ایسا ہی ہوا۔ شہر سے لوٹ رہا تھا پچ جنگل میں تھا کہ رات پڑ گئی۔ لامبی پیشنا اور سخنکھارتا چلا جا رہا تھا کہ ایسا لگا کہ کوئی مجھے پکارہا ہے۔ کان لگائے۔ نعت خان نعت خان میں نے جیسے کانوں میں کڑوا تیل ڈال لیا ہو۔ جواب میں ہنکار بھی نہیں بھرا۔ بس دل ہی دل میں قل پڑھنی شروع کر دی۔ بس پھر آواز نہیں آئی۔ اس وقت تو جی قل مجھے پوری یاد تھی۔ روز جو پڑھنی پڑھتی تھی۔ اب بہت دن سے پڑھنی نہیں تھی تو یاد نہیں رہی۔ آپ جی مجھے یاد کر دیں۔ رکا پھر کہنے لگا ”اس وقت تو جی ایسا تھا کہ جب بھی جنگل میں رات پڑ جاتی تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاوے تھا۔ بس پھر قل ہی کا دم آوے تھی۔ ایک بیری تو ایسا ہی ہوا تھی کہ میں بہت ہی ڈر گیا۔ گھنی رات ہو گئی۔ میں نیچ جنگل میں۔ پھر ایسے لگیں جیسے بھوت کھڑے ہیں۔ چلا جا رہا تھا کہ ایک پیڑ کی ٹھینیوں میں چھپا ہوا کوئی پرندہ تھا۔ ایک دم سے پھر پھر ایسا۔ پھر پھر اہٹ اور پھر لمبی قائمیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بس فوراً ہی قل پڑھنی شروع کر دی۔ نعت خان نے جھر جھری لی اور چپ ہو گیا۔

پرندہ خود دکھائی نہ دے بس رات کے سنانے میں پروں کی پھر پھر اہٹ سنائی دے اور قائمین کی لمبی آواز جس سے فضا گونج جائے۔ ڈرنے کی بات تو ہے۔ مگر ان حبیب نے اس کی آواز کبھی نہیں سنی۔ پروں کی پھر پھر اہٹ بھی نہیں۔ بس شپروں کی سمنا ہٹ جیسے کوئی بڑا پرندہ تیزی سے اڑتا ہوا برابر سے نکل گیا ہے۔ بس اسی سے ایک انجانا ڈر اس کے اندر سما گیا تھا۔ کتنے وسو سے اس کے اندر پل بڑھ رہے تھی کہ کبھی کبھی پورا شہر ہی اسے کھانے کو آتا ہے۔

"اے عبد اللہ یہ تیرا شہر عجب ہے کہ مجھے جس شدت سے رجھاتا ہے اسی شدت سے ڈراتا ہے۔ مسجدوں، حماموں اور باغوں سے معمور یہ شہر کتنی آہستہ سحر بن کر مجھ پر چھاتا چلا گیا، میرے اندر اتر گیا۔ کتنی دفعہ مجھے گمان ہوا کہ بھاری کو ہوں والی وہ میری مددقاً نہیں کہیں ہے۔ اس کے لئے میں نے اس شہر کو کتنا کھوندا ہے۔ مگر شاد آباد کو چوں میں مہکتے حماموں کے قریب سے گزرتے ہوئے، شہرتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں چلتے ہوئے کبھی کبھی عجب سا احساس ہوتا ہے کہ جیسے میں خرابے میں بھکتا پھر رہا ہوں اور اے عبد اللہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اشبلیہ جسے میں بھول چلا تھا۔ میرے خوابوں میں واپس آ گیا ہے۔" اہن جبیب چپ ہوا تال کیا۔ پھر افسر دہلی جہ میں بولا مگر رات میں نے عجب خواب دیکھا جیسے میں وہاں گیا ہوں اور شاداں و فرحاں پھر رہا ہوں جیسے وہی گھر ہے، وہی ہمارے جد امجد والا۔ میں خوش ہوں۔ پھر چونکتا ہوں۔ پوچھ رہا ہوں کہ وہ جو کنوں میں کے برابر کھجور کھڑی تھی۔ وہ شجر سایہ دار بیہاں سے کہاں غائب ہو گیا۔ مگر کوئی جواب ہی نہیں دے رہا ہے۔ میں پریشان ہوں پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دیوار پر بیٹھی ایک بلی مجھے گھور رہی ہے۔ میں ڈر جاتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہ جو ہماری بزرگ بلی تھی۔

"صاب جی ٹیلی فون نج رہا ہے"

میں نے ہڑبرڑا کر خاموش رکھے ٹیلی فون پر نظر ڈالی۔ "نہیں کوئی نہیں نج رہا ہے۔"

نعمت خان نے جماہی لی اور سوچتے ہوئے بولا "اچھا پر مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ بس مجھے جھوٹکا آ گیا تھا اور پھر لگا کہ ٹیلی فون نج رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ پھر اس نے ایک جماہی لی اور نیند بھری آواز میں بولا" اب میں جانوں پچھلا پھر ہے۔ بس صبح ہونے کو ہے۔

اس کے کہنے سے مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ تو بیٹھے بیٹھے پوری رات گز گئی اور اسی کے ساتھ مجھے ایک دم سے نیند کا ایک جھونکا سا آیا۔ بیٹھے بیٹھے میں تھوڑا کھکھ کا اور لیٹ گیا۔ بس تکیے پر سر رکھا اور فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی اور آنکھ لگی سوگی۔ ڈر جو چوتھے چلا ہو کہ کب چڑیاں بولیں۔ کب مرغ نے بانگ دی۔ کب اذان ہوئی بس پھر ٹیلی فون کی تھنٹی ہی سے میری آنکھ کھلی۔ ہڑبرڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رسیور اٹھانے لگا تھا کہ بند ہو گیا۔ جانے کتنی دیر سے نج رہا تھا اور کتنی دیر نج کر خاموش ہو گیا۔ نعمت خان کمرے میں نہیں تھا۔ ممکن ہے اپنی کوٹھری میں جا کے سو گیا ہو۔ آخر کسی نہ کسی وقت اسے بھی تو نیند آئی تھی اور اس نے بھیک کہا کہ کجھ نیند اسی چیز ہے کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے تو فون بند ہو چکا تھا اور مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ ساری رات جاگ کر اسی وقت سونا تھا اور سو بھی گیا تھا تو اس طرح کیوں سویا کہ سرہانے رکھے فون کی تھنٹی بھتی رہی اور کجھ نہیں کھلی۔ اسی فون کا تو ساری رات انتظار رہا تھا اور اسی کے آنے

کے ہنگام آنکھ لگ گئی۔ مگر خیرفون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا ”ہیلو کون رفیق صاحب ہاں جلدی سے بتائیے خیریت تو ہے تا..... ہاں ہاں آئیے مگر مجھ بھائی..... کیوں تو آپ اسکے مگر کیوں مجھ بھائی کیوں اچھا پھر میں انتظار کر رہا ہوں۔“

مجھ بھائی نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا۔ یہی کہتے رہے کہ آرہا ہوں، میرا انتظار کرو پھر بجی بہت کچھ واضح ہو گیا۔ مگر واضح ہونے کے باوجود میں آس اور یاس کے بچھ متعلق تھا۔ جان حلق میں انکی ہوئی تھی۔ رفیق صاحب جلدی سے آئیں۔ کسی طرح اس تذبذب سے تو نجات ملے۔

نعمت خان جانے کس وقت کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جب نظر اٹھائی تو وہ خاموش کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا کہ ”رفیق صاحب آرہے ہیں۔ جلدی پہنچنے والے ہیں۔ چائے بناؤ۔“

”اچھا جی۔ کہتے کیا ہیں۔“

”آ تو رہے ہیں۔ چائے بناؤ۔“

نعمت خان مطمئن تو کیا ہوتا۔ اب شاید زیادہ ہی پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مزید کوئی سوال کرے یا چلا جائے کچھ کہتا چاہتا تھا مگر پھر کہتے کہتے رک گیا اور باہر چلا گیا۔

رفیق صاحب نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ مگر میں ان کے آتے آتے آس اور پاس کے دورا ہے سے گزر لیا تھا اور اپنے سارے اضطراب سے فارغ ہو لیا تھا سو جب وہ آئے تو مجھے یہ جانے کی کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ کیا کہیں گے۔

”رات تو اتنی افراتفری تھی رفیق صاحب بیٹھتے ہوئے کہنے لگے“ کہ کچھ پڑتے ہی نہیں چل رہا تھا کہ کس کے ساتھ کیا گزری اور کون کہاں ہے کس عالم میں ہے اموات تو ہوئی ہیں مگر زخمی زیادہ ہوئے ہیں تو بہر حال تو قع تو ہی ہے۔ ہبتال کے اندر باہر عزیز روں رشتہ داروں کا بہت ہجوم تھا۔ مگر کچھ پڑتے نہیں چل رہا تھا۔ اتنی جلدی کیسے پڑتے چل سکتا تھا۔ ہبتال کا عملہ بھی اپنی جگہ سچا تھا۔ رفیق صاحب کا الجہد چغلی کھارہاتھا کہ وہ دل جوئی زیادہ کر رہے ہیں۔ حقیقت حال کم بیان کر رہے ہیں۔ وہ بول رہے تھے اور میں خاموش ان کا منہ تک بولتے مجھے دیکھا پھر وہ بھی چپ ہو گئے۔

نعمت خان چائے لے کر آ گیا۔ اس نے خود ہی چائے بنائی۔ چائے بنانے کا ایک ایک پیالی ہم دونوں کے سامنے سر کا دی۔ پھر سر

تجھا کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ چائے واقعی بہت گرم تھی۔ دونوں پیالیوں سے بلکی بلکی بھاپ انھر ہی تھی۔ پھر بھاپ بیٹھ گئی۔ چائے تھنڈی ہوتی چلی گئی۔ ہم اسی طرح گم صمیمیت رہے نہ کوئی بات کی نہ پیالی کو ہاتھ لگایا۔

چائے تھنڈی ہوتے ہوتے بالکل ہی تھنڈی ہو گئی۔ سمجھنے کہ برف ہو گئی۔ ہم اسی طرح گم میٹھے تھے اتنے گم کہ جنبش تک نہیں کی۔ بس جیسے ساکت ہو گئے ہیں۔ دو خاموشی کے توارے تھیں میں تھنڈی چائے سے لبریز دو پیالیاں۔

کتنی دیر کے بعد رفیق صاحب نے جنبش کی۔ انھوں نے ہوئے اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تکلیف تو اب نہیں ہے۔ ”نمیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ مگر زیادہ بیس جملیں نہیں۔ زخم مندل ہونے میں وقت لے گا۔ بس آرام کریں۔“ پھر چلتے چلتے مجھے ہوئے کہا۔ ”ویسے ابھی میں مایوس نہیں ہوں۔ پھر ادھر ہی جارہا ہوں۔ کیا خبر ہے کہ..... میں چپ رہا۔

رفیق صاحب کمرے سے نکل رہے تھے کہ نعمت خان آہستہ سے قریب آیا اور مرے ہوئے لجہ میں بولا ”رفیق صاحب جی اب کیا ہو گا۔“

”نعمت خان تمہیں تو اللہ پر بہت بھروسہ ہے۔“

”ہاں جی اور کس پر بھروسہ کریں۔“

”تو بس اس پر بھروسہ رکھو۔ میں پھر ادھر ہی جارہا ہوں۔“

رفیق صاحب چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی نعمت خان بھی کمرے سے نکل گیا۔ دروازے تک انہیں چھوڑنے گیا ہو گا۔ مگر پھر واپس میری طرف نہیں آیا گھر ہی میں ہو گا مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھی جا چکا ہے۔ اب میں اکیلا تھا بالکل اکیلا جیسے رات پڑ گئی ہو اور میں اکیلا جنگل میں چلتا۔ چلتا کیا معنی میں تو جما بیٹھا تھا۔ جہاں بیٹھا تھا بس وہیں جما کا جمارہ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اب میں یہاں سے ہل نہیں سکتا جگد نے جہاں میں بیٹھا ہوں مجھے باندھ لیا ہے۔ میں بندھا بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وقت کا احساس باقی رہا ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ کتنی دیر تک میں یوں دم بخود بیٹھا رہا۔

کتنی دیر بعد میں نے پھر ریلی۔ پھر بننے کب تک بیٹھے رہو گے۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کتنی ملامت کی۔ ایک دوست ڈھونڈنے کے لئے نکلا ہوا ہے۔ واقعی کیا خبر ہے کہ زندگی بہت ارزش ہو گئی ہے مگر سخت جان بھی ہے اور پھر زندگی میں مجرمے بھی تو

۱

ہوتے ہیں تو میں نے کیوں اتنی جلدی فرض کر لیا اور صبر کر لیا۔ مجھے بھی ڈھونڈنے کے لئے لکھنا چاہئے ایک پھریری سی آئی کہ بر قی رو کی مثال پورے جسم میں دوڑ گئی۔ میں یکدم انھے کھڑا ہوا۔

دلیز سے قدم نکالتے ہیں ٹھٹھکایہ کون سا شہر ہے۔ وہی شہر تو پھر میں وہی نہیں ہوں۔ اس جانے بوجھے شہر میں اچانک میں اجنبی بن گیا تھا۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سامنے جنگل پھیلا ہوا تھا اور رات پڑھکی تھی۔ پھر؟ کب تک یوں ڈالوں کھڑا رہوں گا۔ بھگی باندھی۔ اپنے تذبذب پر قابو پایا۔ ان قدموں نے اس شہر کے کوچوں کی بہت خاک چھانی ہے۔ خود ہی راستہ تلاش کر لیں گے۔

کتنی دیر تک چلتا رہا۔ میں نہیں، قدم خود ہی راستہ تلاش کرتے رہے، بڑھتے رہے، مسجدیں، حمام و رخت شہتوں کے، زیتون کے، کھجور کے، ان رستوں کو تو میں پہچانتا ہوں۔ یہ حمام الجوزہ ہے اور یہ رابطہ الموت ہے۔ یہ زناقت اوری آگیا۔ اس راہ پر گیا تو مدینہ الحمرا میں جا کر نکلوں گا۔ یہاں سے میں القصر یہ کی طرف مزگیا۔ رحبات المسجد الاعظم، مسجد الاعظم اتنی خاموش۔ نمازی کہاں گئے؟ جامع اتا بعین کی طرف سے گزر اتواء سے بھی خاموش پایا۔ باب النبو و سے گزر کر مسجد القطانین کی طرف ہولیا۔ عبداللہ کے تندور کے پاس سے گزر اتو حیران رہ گیا تندور ٹھنڈا پڑا تھا اور عبداللہ۔ وہ کہاں گیا۔ حیران و پریشان باب الزیاد کی راہ پر پڑ لیا۔ چلتے چلتے اچانک ٹھٹھک گیا۔ یہ کون سے کوچے میں نکل آیا ہوں یہ تو باب الرملہ ہے مگر باب الرملہ اور اتنا خاموش۔ دونوں وقت مل رہے تھے، مل کر جدا ہو رہے تھے پھر چرانی کیوں روشن نہیں ہوئے۔ آگ بجھ چکی تھی۔ خلقت کہ یہاں امدی ہوئی تھی، تتر بتر ہو چکی تھی۔ باب الرملہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ راکھ بہت اڑ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی ادھ جلا اور ق کسی دیوان کا، کسی صحیفہ کا، کسی فلسفوں کے مخطوطے کا، کسی صوفی کے مفہومات کا، باقی سکوت تھا۔ صرف ایک بلی بیچ راہ میں بیٹھی اپنی کنپے ایسی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

